اقبال یوسف کے نام میر خلیل الرحمان کا گالیوں بھرا خط

اقبال یوسف صاحب!

وعلیکم السلام ۱۴/ مارچ ۱۹۹۰ء

بحوالہ آپ کا خط مورخہ ۱۲/ مارچ جو فیکس کی مشینی تاریخ کے مطابق ۱۳/ مارچ کی شام کو سات بجے بھیجا گیا اور جس میں یہ کہا گیا ہے کہ میں اس کا جواب اگلے روز یعنی کل ۱۳/ مارچ کو بھیج دوں اور پھر یہی خط آج بروز بدھ ۱۴/ مارچ ۱۹۹۰ء کو بذریعہ TCS دن کے گیارہ بجے وصول ہوا۔ اس میں بھی یہی لکھا تھا کہ میں ۱۳/ مارچ تک جواب دے دوں۔ صرف اسی بات سے آپ کی بدباطنی، بدنیتی اور مکاری واضح ہو جاتی ہے۔

آپ کو جب وزیراعلیٰ سندھ کے مشیر کے عہدہ سے علیحدہ کر دیا گیا تو آپ نے میرے دفتر میں میرے پاس روزانہ آنا جانا شروع کر دیا۔ آپ یہ کہتے رہے کہ اب مشاورت نہیں رہی تو آپ صحافت میں آ گئے ہیں اور اپنے پرچے کے پہلے شمارے کے لیے (اس پرچے کا نام آپ نے مجھے جہاں نما یا جہاں گرد بتایا تھا) آپ کو میرا انٹرویو چاہیے جو میری صحافتی زندگی اور اس کے نشیب و فراز کے بارے میں ہوگا۔ آپ نے مجھے یقین دلایا تھا کہ آپ مجھ سے اس کے علاوہ کوئی سوال نہیں پوچھیں گے اور اگر صحافت سے ہٹ کر کوئی سوال یا سوالات آپ کے ذہن میں ہوں گے تو وہ آپ لکھ کر دیں گے اور میں بھی لکھ کر جوابات دوں گا۔ مگر جب آپ کا پرچہ نکلا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ آپ صرف کینہ پرور، مکار اور بدباطن ہی نہیں ہیں بلکہ بہروپیہ اور فریبی بھی ہیں۔ آپ نے اپنے ہفت روزہ کا جنگ سے ملتا جلتا نام رکھ کر اور روزنامہ جنگ کے ڈیزائن اور اسٹائل کی نقل کر کے (جس کا نام اور اسٹائل ٹریڈ مارک جنرل ۱۹۵۰ء میں رجسٹرڈ ہے) لوگوں کو دھوکہ دیا اور اخبار بین طبقے کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ جیسے یہ پرچہ جنگ والوں نے ہی نکالا ہو۔ اس سے آپ کی مجرمانہ اور پاپی ذہنیت کا پتہ چلانا مشکل نہیں رہتا اور آپ کی خصلت اور طبعی خصوصیت کے پیش نظر جس کے ذریعے آپ لوگوں کو بدنام کرنے، ان پر تہمتیں لگانے اور

انھیں نقصان پہنچانے میں ذرا بھی عار نہیں سمجھتے اب یہ سمجھنا بھی آسان ہوگیا ہے کہ ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے درمیان غلط فہمیاں کیوں پیدا ہوئیں اور ان کا معاہدہ توڑنے میں کون سے عوامل کارفرما تھے۔

آپ نے مجھے جو سوالات بھیجے ہیں وہ بے بنیاد، بے تکی اور بے پر کی باتوں پر مبنی ہیں اور ان سوالات سے آپ کا کمینہ پن اور اوچھا پن منظر عام پر آجاتا ہے اور میرے خلاف آپ کا بغض، عناد اور کینہ بھی کھل کر سامنے آگیا ہے اور یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ آپ کا مقصد صرف مجھے اور اخبار جنگ کو بدنام کرنا اور نقصان پہنچانا ہے۔ آپ نے پہلے بھی میرے انٹرویو کو توڑ مروڑ کر اور اپنی طرف سے ایسے گمراہ کن اور فتنہ انگیز سوالات بنا کر شائع کیا ہے جو آپ نے مجھ سے کیے ہی نہیں تھے اور آپ نوٹ کرلیں کہ میں آپ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔

میر خلیل الرحمان

اقبال یوسف کا جواب

اردو صحافت کے بادشاہ، دنیائے صحافت کے شہنشاہ، آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی کے صدر، ملک کے معزز ترین شخص جناب محترم میر خلیل الرحمٰن ہمارے بزرگ بھی ہیں، محسن بھی اور دوست بھی۔ میر صاحب سے ہماری یاد اللہ جنگ کے حوالے سے نہیں، دہلی سے ہے جہاں میر صاحب گوجرانوالہ سے رضا کارانہ جلاوطنی کر کے آن بسے تھے اور دلی کے گلی کوچوں میں اپنے مستقبل کے سہانے سپنے دیکھتے پھرتے تھے۔ دلی جو کبھی بائیس خواجہ کی چوکھٹ تھی اور جہاں کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑہ چلا آتا تھا مگر دلی کا دامن اور دل بڑا وسیع اور کشادہ تھا جو آتا وہاں سما جاتا پھر وہیں کا ہور ہتا اور اس وقت نکلتا جب اس کا دم نکل جاتا، لیکن برِ عظیم تقسیم ہوا تو دلی بھی اجڑ گئی اس اجڑے دیار کی بہت سی کہانیاں لکھی گئیں اور بہت سے لوگ دہلی چھوڑ کر کراچی میں آباد ہوئے۔ میر صاحب کا اخبار جسے ہم نے اچھونائی کی دکان کے سوا اور کہیں نہیں دیکھا تھا، کراچی آگیا تو ہجرت کے طفیل اسے بھی اعزاز و اقبال ملا دیکھتی آنکھوں جنگ کی پتنگ آسمان میں تارہ ہوگئی، انجام سسکیاں لے لے کر مرا، حریت کا گلا گھونٹا گیا اور جس نے مقابلہ کرنے کی ٹھانی اسے میر صاحب نے اڑنگے پر لا کر وہ پٹخنی دی کہ اس کے چاروں چول چوکس ہوگئے۔ دادا عشرت جو آج بھی دہلی کی وجاہت اور شرافت کا نمونہ بنے بزنس روڈ کی گلیوں میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں اور حالات نے انھیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا، اکثر اپنے احباب کی محفل میں کہتے ہیں کہ میاں میرا کیا پوچھتے ہو مجھے تاریخ تھپڑ مار کر گزر گئی ہے اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کونسی تاریخ، تاریخ ہند، تاریخ سلطنت روما، تاریخ

یونان یا تاریخ عرب تو فرماتے ہیں تاریخ جنگ و جدال جس کے بارے میں ہم نے پہلے اداریے میں لکھا تھا کہ جنگ سے جدال کی ضرورت ہے۔

میر خلیل الرحمان یقیناً عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں ان کا احترام واجب ہی نہیں سب پر فرض ہو جاتا ہے، وہ اپنے آداب اور لحاظ سے کس قدر نا واجب احترام سہی مگر وہ جہاز عمر رواں پر سوار بیٹھے ہیں اس لیے ان کا احترام، ان کا ادب، ان کی تعظیم، ان کی توقیر ہم سب پر فرض ہے۔ وہ مجھے اپنے والد محترم کی طرح عزیز ہیں اور جب میر صاحب جیسے بزرگوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے قرآن کی وہ آیت یاد آتی ہے جس میں اہل ایمان کو سختی کے ساتھ متنبہ کیا گیا ہے۔

''کہ جب تمہارے ماں باپ بوڑھے ہو جائیں تو انھیں اف تک نہ کہو''۔

اس ہدایت کا بنیادی فلسفہ اردو کا وہ محاورہ ہے کہ بچہ اور بوڑھا برابر ہو جاتے ہیں۔ بڑھاپے میں آدمی کو اپنے حواس پر جذبات پر، احساسات پر خیالات پر اختیار نہیں رہتا وہ بے اختیار ہو کر باؤ گولا ہو جاتا ہے۔ اس لیے عمر کا تقاضا ہے کہ بزرگوں کا احترام کیا جائے۔

محترم میر خلیل الرحمان سے ہفت روزہ اخلاقی جنگ کے لیے انٹرویو ۲/ مارچ ۱۹۹۰ء کو جنگ بلڈنگ پرنٹنگ ہاؤس آئی آئی چندریگر روڈ دوسری منزل پر واقع ایڈیٹر انچیف کے پہلے کمرے میں لیا گیا۔ اس انٹرویو کے لیے میں فروری کے آغاز سے میر صاحب سے درخواست کر رہا تھا مگر میر صاحب ٹالتے رہے اس کی بنیادی وجہ ان کی شرافت اور شہرت سے گریز پائی ہے۔ میری معلومات کے مطابق انھوں نے صرف ایک رسالے ''عقاب'' کے ایڈیٹر طارق محمود میاں کو انٹرویو دیا تھا جو کوجا کے صدر ہیں اس کے علاوہ ان کا کوئی انٹرویو میری نظر سے نہیں گزرا۔ آوازوں کے عالمی شہرت یافتہ لطف اللہ خان نے مجھے بتایا کہ ان کے میر صاحب سے چالیس سالہ کاروباری تعلقات ہیں، ان کے خزانے میں پچپن ہزار آوازیں محفوظ ہیں، فیض احمد فیض کا مکمل کلام ان کی اپنی آواز میں موجود ہے، پاکستان کے تقریباً ہر چھوٹے بڑے آدمی کا انٹرویو یا آواز محفوظ ہے لیکن میر خلیل الرحمان سے وہ چالیس سال سے درخواست کر رہے ہیں مگر میر صاحب وقت نہیں دیتے، ٹال جاتے ہیں، لطف اللہ خان کی یہ روایت ہمارے لیے شوق مہم جوئی بن گئی، ہم نے بھی فیصلہ کرلیا کہ میر صاحب سے اخلاقی جنگ کے لیے انٹرویو لے کر رہیں گے۔ اخلاقی جنگ کے ڈیکلریشن لینے کی اطلاع سب سے پہلے میر صاحب کے بڑے صاحب زادے میر جاوید الرحمان کو ہوئی تھی۔ میں ایک روز ایک معاملے پر گفتگو کے لیے دفتر جنگ گیا تو یونس ریاض صاحب کے شیشے والے گھر میں رپورٹرز کی میٹنگ جاری تھی۔ جاوید صاحب مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں اور مجھ پر ان کی شفقت بھی بہت زیادہ ہے۔ میٹنگ کے دوران ہی انھوں نے مجھے اندر بلا لیا اور یونس ریاض اور دیگر افراد کی موجودگی میں

بے ساختہ پوچھا ''یار تمہارا اخلاقی جنگ کب آرہا ہے؟ میں اس کا بڑی شدت سے انتظار کر رہا ہوں'' ان کی آرزو پوری کرنا ضروری تھا کیونکہ میرے حافظے کے مطابق انھوں نے زندگی میں مجھ سے پہلی بار کوئی فرمائش کی تھی۔ اخلاقی جنگ کے تمام انتظامات مکمل کر لیے گئے تو فیصلہ یہی ہوا کہ پہلا انٹرویو میر خلیل الرحمان کا لیا جائے۔ میر صاحب سے بار بار وقت لینے کی کوشش کی گئی مگر وہ پہلو بچاتے، دامن چھڑاتے اور آنکھیں چراتے رہے مگر آخر کار بحث وتمحیص کے بعد ۲/ مارچ بروز جمعہ کو انٹرویو دینے کے لیے آمادہ ہوگئے۔ اتفاق سے اس موقع پر ان کے چھوٹے صاحب زادے میر شکیل الرحمان بھی موجود تھے جو اپنے ذوق نفاست کی بدولت مجھے بہت عزیز ہیں۔ یہ پورا انٹرویو صرف اور صرف اخلاقی جنگ کے لیے لیا گیا اور ہفت روزہ اخلاقی جنگ کے شمارہ ۱۲ کے صفحات ۱۵ پر یہ سوال واضح طور پر درج ہے کہ ''نومبر میں جب عدم اعتماد کی تحریک پیش کی جارہی تھی تو اخبارات میں ایک غیر اخلاقی جنگ شروع ہوگئی تھی، ہم نے محسوس کیا کہ اخلاقی جنگ ہونا چاہیے اس حوالے سے اور ہم ان چیزوں کا جواب دیں اس میں سب سے پہلے آپ کا انٹرویو لیا'' [ہفت روزہ اخلاقی جنگ صفحہ ۱۵ شمارہ ۲]

یہ پورا انٹرویو ٹیپ ریکارڈ پر محفوظ کیا گیا اور اسے قرطاس پر منتقل کرتے ہوئے نہایت احتیاط برتی گئی صرف وہ مقامات جہاں بہت طوالت تھی اسے حذف کر دیا گیا مگر پورے انٹرویو میں کسی قسم کا حک واضافہ نہیں کیا گیا۔

میر صاحب سے طے ہوا تھا کہ انٹرویو ان کی صحافتی زندگی پر محیط ہوگا اور جب صحافت کی بات آتی ہے تو پھر سیاست کی لیلیٰ خود آنچل ہٹا کر اپنا مکھڑا دکھانے لگتی ہے۔ لہٰذا صحافت کے حوالے سے بھٹو خاندان کا ذکر بھی آیا جس پر میر صاحب کئی بار آپے سے باہر بھی ہوئے۔ مگر انھوں نے بہت سی ایسی باتیں بھی بتائیں جو شاید بھٹو خاندان کے علم میں بھی نہیں ہیں۔ میر صاحب اور بھٹو صاحب کی دوستی کی یہ داستان میر صاحب نے جس تال، سر اور لے میں سنائی ہے اس کا اصل لطف تو کیسٹ سننے میں ہے لفظ آزاد ہو کر سفید وسیاہ ہو جائے تو اپنا اصل لطف، اصل مزہ کھو دیتا ہے اور چہرہ گم کر دیتا ہے شکر ہے کہ یہ داستان میر صاحب کے خالص دہلوی لہجے میں ہمارے پاس محفوظ ہے اور ہر طالب کے لیے اس کا نسخہ تحفتاً ہدیتاً اور عاریتاً حاضر ہے۔

بھٹو خاندان کے لطیف تذکرے کے ساتھ ساتھ میر صاحب اس ذکر کی تلخی سے بھی آزردہ اور افسردہ ہوئے ہوں گے اور آزردگی کا یہ احساس اس وقت شدید ہو گیا جب انٹرویو اپنے اختتامی مرحلے پر پہنچا اس سے قبل ہی میر صاحب نے فرمایا ''آپ مجھے سوالات لکھ کر بھیج دیں، میں آپ کو جوابات لکھ کر بھیج دوں گا، آپ صرف صحافت کے حوالے بات کریں پہلا سوال آپ نے اس کے مطابق کیا۔ [ہفت روزہ اخلاقی جنگ صفحہ ۱۵ شمارہ ۱۲]

حالانکہ میر صاحب سے جتنے سوالات کیے گئے وہ میر صاحب کی صحافت، ان کے اخبار اور ان کے

پیشہ ورانہ فرائض کے حوالے سے کیے گئے تھے لیکن میر صاحب جواب بھی دیتے گئے، انکار بھی کرتے گئے دراصل میر صاحب کو یقین نہیں تھا کہ یہ انٹرویو فی الحقیقت یا سچ مچ لیا جا رہا ہے وہ یہی سمجھتے رہے کہ یہ محض لفظوں کی جگالی ہے۔ انھیں یقین تھا کہ نہ یہ انٹرویو چھپے گا نہ اخلاقی جنگ نکلے گا کیونکہ میر صاحب نے اپنے ذرائع سے یہ معلومات حاصل کر لی تھیں کہ ہمارے پاس آدمی ہیں نہ سرمایہ، نہ اسٹاف بھرتی کیا گیا ہے نہ معقول دفتر ہے اور نہ ہی دفتر میں خدمت گار ہیں اور ۲/ مارچ کو انٹرویو لیا جا رہا ہے تو ۸ مارچ کو جمعرات کے دن اے پی این ایس ایوارڈ کی تقریب میں نہ رسالہ پہنچ سکتا ہے نہ چھپ سکتا ہے، نہ طبع ہو سکتا ہے نہ تقسیم ہو سکتا ہے یہی وہ یقین تھا جس کے باعث میر صاحب چھاجوں برسے، کھل کر بولے اور دل کی باتیں رواروی اور روانی میں اخلاقی جنگ کے لیے روانہ کر دیں۔ انٹرویو کے اختتام پر ہم نے میر صاحب سے پوچھا کہ آپ کو تحریری سوالات کب بھجوائے جائیں تو انھوں نے فرمایا کہ جب آپ کی مرضی ہم نے عرض کیا اگر ہم پندرہ بیس منٹ بعد آپ کو وہ سوالات پہنچا دیں تو کیا آپ دفتر میں ہی ہوں گے تو میر صاحب نے کہا، میں ابھی یہیں ہوں سوالات تو تیار تھے اور ہم سوالنامے میں سے چند سوالات پوچھ چکے تھے لہٰذا فوری طور پر فوٹو اسٹیٹ کرانے کے بعد وہ سوالنامہ ۲/ مارچ کو ہی پندرہ بیس منٹ کے بعد میں نے میر صاحب کے حوالے کر دیا۔ میر صاحب اس وقت بہت عجلت میں تھے، شکیل صاحب کے ساتھ کہیں جا رہے تھے لہٰذا انھوں نے وہ سوالنامہ رکھ لیا اور سلام دعا کے بعد وہ اور ہم اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ۸/ مارچ کو جب اخلاقی جنگ کا پرچہ بازار میں آ کر اے پی این ایس ایوارڈ میں تقسیم ہو گیا تو میر صاحب کی آتش غضب بھڑک اٹھی، میں نے اگلے روز ان سے سوالنامے کے جوابات کے لیے رابطہ کیا تو فون اٹھا کر رکھ دیا گیا۔ میں مسلسل میر خلیل ارحمان اور میر جاوید الرحمان سے رابطہ کرتا رہا لیکن وہاں جب بھی میری آواز پہچانی گئی فون رکھ دیا گیا۔ مجبوراً سوالنامے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی جنگ کے چیک پوسٹ پر پہنچائی گئی، مگر اس کی رسید نہیں دی گئی لہٰذا جنگ کے دفتر فون کر کے شمس حنفی اور محمد سلیمان کو اس کی اطلاع دی گئی انھوں نے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ لہٰذا سوالنامہ فیکس کے ذریعے ۱۳/ مارچ کو بھیجا گیا اور اسے ٹی سی ایس کے ذریعے بھی روانہ کیا گیا تا کہ سند رہے۔ میر صاحب کے جوابات کے لیے ہم نے ہفت روزہ اخلاقی جنگ کی اشاعت میں تاخیر کا فیصلہ کیا اور میر خلیل الرحمان کے جوابات کے انتظار کے باعث ہمارا پرچہ جمعرات کے بجائے جمعہ کو بازار میں آ سکا مگر اس انتظار، لذت انتظار کا صلہ یہ ملا کہ پاکستان کے معزز ترین بلکہ دنیا کے معزز ترین شخص، وی آئی پی شخصیت جناب میر خلیل الرحمان صاحب نے ہمیں ۱۴/ مارچ ۱۹۸۹ء کو مسجع مقطع دہلوی گالیوں سے بھرپور خط لکھا جسے پڑھ کر بے اختیار ایک شعر یاد آ گیا۔

اے داغ برا مان نہ تو ان کے کہے کا
معشوق کی گالی سے تو عزت نہیں جاتی

ساحل جولائی ۲۰۰۶ء

ہم میر صاحب سے، ان کی صحافت سے، ان کی شخصیت سے بے پناہ عشق کرتے ہیں، انھیں ہماری آتش عشق کی چنگاری کا اندازہ ہی نہیں۔ اردو شاعری میں سارے محبوب، سارے معشوق بے وفا نکلے ہیں، تمام شاعروں کا تجربہ یہی ہے سوائے جوش ملیح آبادی کے میر صاحب کی گالیاں ہمارے لیے مصری کی ڈلیاں اور پھولوں کی کلیاں ہیں ان کے قلم سے نکلنے والا خط ادب عالیہ اور اخلاق عالیہ کا شاہکار ہے۔ اردو کی تاریخ میں دیوان مضحک و مصحفی، جعفر زٹلی، چرکین اور دیوان عریاں کے بعد میر خلیل الرحمان کا یہ خط درنایاب اور گوہر کمیاب ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تاریخ ادب اردو میں اسے سیاہ حاشیے میں ضرور جگہ دیں گے۔

میر خلیل الرحمان کا خط ان کے داخلی انتشار، ذہنی خلفشار اور باطنی اضطرار کا آئینہ دار ہے۔ اس آئینے کو ہم سلامت رکھنا چاہتے ہیں اور اس آبگینے کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتے۔ آئینے میں بال آجائے تو کبھی نہیں جاتا حتیٰ کہ آئینہ چلا جاتا ہے پر بال نہیں جاتا۔ میر صاحب نے اپنے انٹرویو میں بال بال بچنے کی کوشش کی۔ اس کوچے میں قدم نہ رکھنے کی قسم کھائی مگر پھونک پھونک کر قدم رکھے روا روی میں وہ اتنا کچھ کہہ گئے کہ انھیں اپنا کہا پڑھنے کے بعد یاد آیا۔ ضیاء الحق، محمد خان جونیجو، ایم کیو ایم، نواز شریف اور ایوب خان کے بارے میں انھوں نے جو کچھ کہا یقیناً اسے پڑھ کر وہ خود خفیف، نحیف اور ضعیف ہوئے ہوں گے لیکن اس کا کیا کیجیے کہ انھوں نے کہا، ہم نے سنا، ٹیپ نے محفوظ کیا اور قرطاس و قلم نے اسے جاوداں کر دیا۔

میر خلیل الرحمان نے مجھے اپنے خط میں بد باطن، بدنیت، مکار، بہروپیا، فریبی، مجرم، پاپی، کمینہ، اوچھا اور خدا جانے کیا کیا لکھا ہے یہ ان کا کرم ہے، ان کی نوازش ہے، ان کی عنایت ہے، ان کی محبت ہے، ان کا ظرف اور حسن سلوک ہے، شرافت ہے، مروت ہے میں میر صاحب کی ان گالیوں کو خندہ پیشانی سے قبول کرتا ہوں مگر تسلی نہیں ہوتی۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

جناب میر خلیل الرحمان صاحب

آپ کی عظمت کا پرچم خود آپ کے قلم سے تار تار اور داغ داغ ہوا ہے مگر اس کے باوجود میں آپ کو نہایت کشادہ دلی اور فراخی کے ساتھ معاف کرتا ہوں۔ آپ کے سارے الزامات جھوٹ، افتراء، لغو، بے بنیاد اور غلط ہیں۔ آپ کی زبان، اسلوب بیان غلط در غلط در غلط ہے لیکن آپ کی اس تبرّیٰ بازی کے باوجود میرے دل میں آپ کی بزرگی و عظمت برقرار ہے۔ میں نے اپنے ہفت روزہ اخلاق جنگ میں آپ کا انٹرویو حرف بہ حرف شائع کیا ہے۔ آپ کو یقین نہ آئے تو اس کا ٹیپ کسی بھی عوامی مقام پر سنانے کے لیے تیار ہوں فیصلہ عوام کریں گے۔

ساحل جولائی ۲۰۰۶ء

جہاں تک عدالتوں اور قانونی چارہ جوئی کا تعلق ہے، میں آپ کو مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ اس میں تاخیر کیوں، اتفاق فاؤنڈری والوں کی طرح آٹھ مہینے جونا تھن کو لنگر انداز رکھ کر اشتہاری مہم چلانے کے بعد آخر کار عدالت جانے کی روایت ترک کر کے آپ فوری عدالت کے دروازے پر دستک دیں ہمیں معلوم ہے کہ آپ اس ملک کے آئین اور قانون کے کتنے زبردست محافظ ہیں اور آزادی صحافت کی آڑ میں آپ کے اخبار نے ملک کے مقتدر سیاست دانوں کے خلاف کتنے سنگین اخلاقی جرائم کیے ہیں اس کی تاریخ عدالت میں بیان ہوگی۔

ابوالکلام آزاد نے کہا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ ناانصافیاں جنگ کے میدانوں کے بعد عدالت کے ایوانوں میں ہوئی ہیں مگر میں ابوالکلام کے اس قول کو سہو کلام سمجھتا ہوں۔ عدالتوں کے دروازے، جیل کی دیواریں، پھانسی کے پھندے، پیٹھوں پر کوڑے، عقوبتیں اور سزائیں میرے لیے نئی نہیں ہیں، ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور سیاست میں قدم رکھا ہے ہماری منزل دار و رسن رہی ہے، زنجیروں کے حلقے ہمارے لیے نئے نہیں ہیں میں اس قافلے کا ایک فرد ہوں جس قافلے والوں نے اپنی پیٹھ پر ۶۵ ہزار کوڑے کھا کر اس ملک کو جمہوریت کا مکھڑا دکھایا ہے۔

میر صاحب آیئے عدالت چلتے ہیں عدالت کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں آیئے ہم دونوں ایک نئی تاریخ لکھیں آپ جبر کی تاریخ لکھیں، میں صبر کی تاریخ لکھوں، آپ شر کی تاریخ لکھیں، میں خیر کی تاریخ لکھوں، آپ میرے جرائم عدالت کو بتائیں اور میں آپ کے چالیس سالہ جرائم عدالت کے روبرو پیش کروں میں یوسف صدیقی کی یادداشتیں، اقبال حامد کے مسودات، رئیس امروہوی کے فرمودات اور وہ ساری کہانیاں عدالت کے سامنے پیش کرنے کے لیے تیار ہوں جس کے پس منظر میں اسلام، پاکستان اور قرآن و سنت کو آپ کے ظالم قلم نے لہولہو کیا ہے انتظار کس بات کا؟ جایئے زنجیر عدل کھڑکھڑایئے آپ کا خط پڑھ کر مجھے یقین ہے کہ اگر آپ جہانگیر کے دور میں پیدا ہوئے ہوتے تو ہر وقت زنجیر عدل سے لٹکے ہوئے ہوئے۔

آپ کا اور صرف آپ کا اقبال یوسف

ساحل جولائی ۲۰۰۶ء